حقیقتِ نماز

تالیف:

مولانا امین احسن اصلاحی زید مجدہ

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

'میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص تدبرِ قرآن، کی طباعت واشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کردی۔ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پرانے رفقاء میں سے ہیں وہ نہ صرف میرے فکر سے، بلکہ بحیثیتِ مجموعی پورے فکرِ فراہی سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پورے عزم و حوصلے کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج واشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ اپنے ادارہ: فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا! تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارہ' تدبرِ قرآن وحدیث کے تعاون سے وہ قرآنی فکر وفلسفہ بالکل واضح ہوکر لوگوں کے سامنے آجائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصل جواب ہے۔'

حضرت الاستاذ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدظلہ العالی نے جس بے پایاں محبت واعتماد کا اظہار اپنی محولہ بالا تحریر —— دیباچہ تدبرِ قرآن —— میں فرمایا

ہے وہ مجھ عاجز کے لیے سرتاسر اعزاز ہے۔ ان کے اور میرے درمیان اصلاً استاد و شاگرد کا رشتہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا۔ مصنف و ناشر کا رشتہ ان کی نظرِ عنایت سے ۱۹۷۶ء میں استوار ہوا۔ انھوں نے میری تعلیم و تربیت میں آج تک جو کمال رافت فرمائی اور شفقت اٹھائی ہے رسمی اسلوبِ بیان میں اس کا اظہار ناممکن ہے۔ ان سے نسبت ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ ان کے دیے ہوئے پروگرام کی تکمیل ہی میری زندگی کا مشن اور ترجیحِ اول ہے۔ انھوں نے جو شرف بخشا اور اپنے جس عظیم اعتماد کا اظہار فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر کے حضور ملتجی ہوں کہ وہ مجھے ان کی امیدوں کا مصداق بنائے اور فکرِ فراہی و اصلاحی کی ترویج و اشاعت کا جو زریں تاج مجھ بے مایہ فقیر کے سر پہ سجایا گیا ہے اس کی لاج رکھے۔ وبیدہ اللہ التوفیق!

حضرت الاستاذ کا ذوق آشنا ہوتے ہوئے میرے لیے یہ لازم تھا کہ ان کی نگارشات کو ان کے مطلوبہ پسندیدہ معیار کے مطابق پیش کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر ان پر کام شروع کر دیا۔ میں نے بیک وقت شاگرد و ناشر، دونوں حیثیتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ الحمد للہ نظرِ ثانی اور ازسرِ نو کتابت کا بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ پیشکش بھی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

۱- متن پر نہایت اہتمام سے نظرِ ثانی کی گئی ہے۔

۲- قرآن مجید کے تمام حوالے مکمل نقل کیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ تدبرِ قرآن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

۳- کتاب میں موجود تمام اقتباسات کو ان کے اصل ماخذوں سے تقابل کر کے درست کر دیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض جگہ اگر صرف ترجمہ دیا گیا تھا تو ان کی اصل عبارتیں بھی دے دی گئی ہیں۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی پیشکش کے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے اس کی دستیابی میں کچھ عرصہ تعطل رہا جس کے لیے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ اس کے امتیازی محاسن کی روشنی میں اس کے قدرداں مجھے معاف فرما دیں گے۔ اب اس کا موجودہ ایڈیشن ان شاء اللہ ہمیشہ دستیاب رہے گا۔

اس پیشکش میں ہر ممکن احتیاط کے باوصف، اپنی کوتاہیوں کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اس کے قارئین بھی اس کام میں حصہ لیں۔ ان کی جانب سے ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی اور بہتری کی ہر قابلِ عمل تجویز خندہ پیشانی اور شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور آئندہ اشاعتوں میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس پیشکش کی صورت میں مجھ بندۂ حقیر و فقیر سے جو خدمت بن پائی ہے یہ سرتاسر اس کی توفیق اور تائید و نصرت کا کمال ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

لاہور
۲۹ مارچ ۱۹۸۸ء

والسلام
ماجد خاور

حقیقتِ نماز

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے "ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"[1]۔ اس اصول کی سچائی پر تمام دنیا کا اتفاق ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی شے کے حسن و قبح کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں، ہماری نظر فوراً اس کے نتائج و اثرات پر پڑتی ہے۔ اگر وہ موجود ہوتے ہیں اور اچھے ہوتے ہیں، ہم بے تأمل اس شے کے اچھے ہونے کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اگر وہ مفقود ہوتے ہیں یا موجود تو ہوتے ہیں مگر برے ہوتے ہیں تو چاہے اس کے اچھے ہونے پر کتنی ہی دلیلیں قائم کی جائیں، ہم اس شے کی اچھائی تسلیم نہیں کرتے۔ زخم میں ٹیس اور چبھن ہے، اس لیے وہ برا ہے، کوئی اس کو پیار نہیں کرتا۔ مرہم میں ٹھنڈک اور شفا ہے، اس لیے سب اس کو ڈھونڈتے ہیں، کوئی اس کے اچھے ہونے پر ہم سے جھگڑا نہیں کرتا۔

موجودہ زمانے کے لوگ، اسی ترازو سے دینی تعلیمات اور مذہبی احکام کو بھی تولتے ہیں اور جب وہ ان کے وہ اثرات و نتائج موجود نہیں پاتے جو ان کے ساتھ وابستہ بتائے جاتے ہیں تو وہ سرے سے ان احکام کی قدر و قیمت ہی سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ نماز کی دینی و دنیاوی برکتوں سے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے اس کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے سامنے مسلمانوں کا موجودہ اخلاقی اور عملی زوال ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر نماز کوئی مفید اور مؤثر عمل ہے تو مسلمانوں کی اس

---

[1] انجیل لوقا: باب ۶: ۴۴

حالت کو بدل دینا چاہیے، اور اگر یہ حالت نمازیں پڑھنے کے باوجود بھی نہیں بدلتی، مسلمان فسادِ اخلاق و فسادِ عمل کی تمام آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے ہیں تو نماز ایک فعلِ عبث ہے جس کا انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کے برعکس مذہبی گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نماز شخصی اور اجتماعی، دونوں زندگیوں پر نہایت قوی اثر ڈالتی ہے۔ شخصی زندگی پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان خدا کا محبوب بندہ اور معاشرے کا ایک بہترین فرد بن جاتا ہے اور اجتماعی زندگی پر اس کا اثر یہ مترتب ہوتا ہے کہ نماز قائم کرنے والی جماعت زمین کی حکومت اور فردوس کی وراثت کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ یہ اس کے لازمی نتائج ہیں، جو اس سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ آگ کی حرارت اور پانی کی برودت کی طرح ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں، یہاں تک کہ انہی اثرات سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ نماز پائی جائے، اور اس کے یہ اثرات نہ پائے جائیں۔ اگر کبھی ایسا نظر آئے کہ نماز تو موجود ہے، لیکن اس کے جلو میں بہترین عمل اور بہترین سیرت کی جلوہ گری نہیں ہے تو سمجھ جاؤ کہ یہ نماز نہیں ہے، نماز کی چادر میں نفاق دریا ہے۔ اسی طرح اگر جماعتی زندگی کی شرائط کے ساتھ نماز موجود ہو، لیکن اس کے ساتھ دینی و دنیاوی زندگی کی تمام رفعتیں موجود نہ ہوں، یا کم از کم ان کی راہ نہ کھل رہی ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ نماز حقیقت کی روح سے بالکل خالی ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ	پس ہلاکی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے
هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝	لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔ جو
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝	ریاکاری کرتے ہیں اور ادنیٰ چیزوں میں
وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝	بھی بخالت کرتے ہیں۔

(الماعون - ۱۰۷: ۴-۷)

یہ دو مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے بالکل ضد ہیں اور اس زمانے

میں مسلمانوں کی خراب حالت نے بظاہر پہلے دعوے کو قوی تر بنا دیا ہے، اس وجہ سے ضرورت ہے کہ نماز کی حقیقت پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

ایک اصولی حقیقت :

حقیقت یہ ہے کہ ہر کام کے کرنے کے کچھ شرائط و آداب ہیں، جب تک وہ شرائط و آداب پوری طرح ملحوظ نہ رکھے جائیں وہ عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ کسی تخم کے بارآور ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اس کو زمین میں پھینک دیا جائے، بلکہ ضروری ہے کہ تخم صالح ہو، زمین زرخیز اور اچھی طرح تیار کی ہوئی ہو، موسم موافق ہو، ہوا مناسب چلے، پانی وقت کے ساتھ ملے، سورج اپنی تمازت اور شبنم اپنی رطوبت سے اس کی پرورش کرے اور کسان کی نگران آنکھیں ایک پل کے لیے بھی اس کی حفاظت و نگہداشت سے غافل نہ ہوں۔ جب یہ تمام باتیں ضبط و اعتدال کی تمام خوبیوں کے ساتھ پائی جاتی ہیں، تب ایک بیج بارآور ہوتا ہے اور اس کا حاصل، کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی رہ گئی، تخم ضائع ہو جائے گا اور تمام سعی اکارت ہوگی۔

بالکل یہی حال نماز کا ہے۔ بلاشبہ اس کی برکتیں بے پایاں ہیں۔ یہ ایک ہی چیز آسمان و زمین کی تمام سعادتیں بخش سکتی ہے، لیکن اسی وقت جب یہ اپنے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ وجود میں آئے۔ یہ نہیں ہے کہ اسے جس طرح جی چاہے پھینک ماریں اور پھر ماتم کریں کہ بیج کی جھولی خالی ہو گئی، لیکن خرمن دانوں سے معمور نہ ہوا۔

نماز دین کا ستون ہے :

نظامِ دین میں نماز کو جو جگہ حاصل ہے اس کی عظمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس نامہ سے واضح ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے عُمّال کو لکھا تھا۔ انہوں نے نماز کی اہمیت مندرجہ

ذیل الفاظ میں واضح کی تھی :

إِنَّ اهمَّ امرِکُم عندی	تمہارے معاملاتِ دینی میں، میرے نزدیک
الصلوٰۃ فمن حفظها و	سب سے زیادہ اہم نماز ہے۔ جو اس
حافظ علیها، حفظ	کی حفاظت و نگہداشت کرے گا وہ اپنے
دینه - ومن ضیعها	پورے دین کی نگہداشت کرے گا، اور جو
فهو لما سواها	اس کو ضائع کردے گا وہ بقیہ دینی امور کو
اضیع[1]	بدرجۂ اولیٰ ضائع کردے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے قائم کرنے ہی پر تمام دین کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ اگر کسی نے یہ ایک ہی چیز ڈھادی تو اس نے پورے دین کی نیو اکھاڑ دی۔ اسی وجہ سے حدیثوں میں آیا ہے کہ کفر و ایمان کے درمیان حدِ فاصل صرف نماز ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

بین الکفر والایمان	کفر اور ایمان کے درمیان حدِ فاصل نماز
ترك الصلوٰۃ[2]	کا ترک کرنا ہے۔

یعنی اگر ایک شخص نے عمداً نماز ترک کردی تو وہ کفر کے سرحد میں داخل ہوگیا، ایمان سے اس کا رشتہ باقی نہیں رہا۔ یہ ایک چیز چھوڑ کر وہ پورے دین سے دست بردار ہوگیا۔

دین کا نقطۂ آغاز اور نماز :

بعض لوگوں نے ان تمام حدیثوں کی تاویل کرنی چاہی ہے جن میں نماز کو کفر و اسلام کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ فلسفۂ دین کے اعتبار سے جو کچھ ان الفاظ سے ظاہر

---

[1] موطا امام مالک: کتاب وقوت الصلوٰۃ، حدیث ۶

[2] سنن الترمذی: کتاب الایمان، باب ما جاء فی ترك الصلوٰۃ

ہوتا ہے وہی حقیقت ہے۔ جن لوگوں نے اسلام پر حکیمانہ غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ دین کا نقطۂ آغاز ایمان و معرفت ہے جس سے قلب میں شکر و محبت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور نماز اسی شکر و محبت کا اوّلین مظہر اور پھر پورے دین کا سرچشمہ ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی شخص نے نماز ترک کردی تو ایک طرف تو ایمان و معرفت سے اس کی محرومی واضح ہوگئی، کیونکہ اس کے اوّلین فیضان ہی سے وہ محروم رہا۔ دوسری طرف اس نے اس سرچشمہ ہی کو بند کردیا جس سے شریعت کی وہ تمام سوتیں نکلتی ہیں جو انسان کے تمام اخلاق و اعمال کو سیراب کرتی ہیں۔

اس اجمال کو کسی قدر تفصیل سے سمجھنا چاہیے۔

ایک انسان جب عقل و رشد کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھنے لگتا ہے تو وہ اپنے اندر اور اپنے باہر خدا کی رحمت و پروردگاری کے بے شمار آثار پاتا ہے۔ ان آثار سے وہ خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اس معرفت کا نام ایمان ہے۔ اس ایمان سے اس پر خدا کی محبت اور شکر گزاری کا جذبہ طاری ہوتا ہے۔ یہ جذبہ بندہ کو خدا کی طرف بڑھاتا ہے، جس سے نماز وجود میں آتی ہے۔ اسی وجہ سے عربی زبان میں نماز کے لیے صلاۃ کا لفظ ہے۔ جس کے معنی اہل لغت میں، اقبال الی الشئ "کسی چیز کی طرف بڑھنے کے ہیں" یعنی بندہ شکر و محبت کے جذبات سے معمور ہوکر اپنے معبود کی طرف لپکتا ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ سورۂ کوثر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"دین کی بنیاد علم و عمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اس علم سے لازماً محبت و شکر کی ایک قلبی کیفیت و حالت پیدا ہوتی ہے، جس سے اعمال کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح علم و عمل میں گویا وہی تعلق ہے جو تعلق اثر اور مؤثر اور ظاہر و باطن میں ہوتا ہے۔ یعنی علم ایمان کے زمرہ کی چیز ہے اور عمل کا تعلق اسلام سے ہے۔

"پھر ایک دوسری حقیقت پر غور کرو۔ عمل جس طرح علم کا مقابل ہے، اسی طرح وہ قول

کا بھی مقابل ہے۔ یعنی قول علم و عمل کے بیچ کی کڑی ہے۔ قول ارادہ کا اوّلین ظہور اور عمل کا عنوان و دیباچہ ہے۔"

" نماز ظاہر ہے کہ قول و اقرار ہے۔ یہ اٹھنا، بیٹھنا، جھکنا، سجدہ کرنا، ہاتھ اٹھانا اور انگلی سے اشارہ کرنا کیا ہے؟ یہ سب اعضاء کی زبان سے ہمارا خدا سے قول و اقرار ہے۔ یہ ایمان کے بعد راہِ اطاعت میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے۔ اسی وجہ سے یہ تمام شریعت کا عنوان قرار دی گئی۔ بکثرت آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارات ہیں۔ مثلاً :

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ	جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں اور نماز
وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ	قائم کرتے ہیں۔"

(البقرۃ - ۲ : ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ معرفت اور ایمان کا پہلا ثمرہ نماز ہے۔ پھر نماز سے تمام شریعت وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں اجمال کا اسلوب ملحوظ ہے وہاں ایمان کے بعد صرف عملِ صالح کا لفظ آتا ہے :

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	بجز ان کے جو ایمان لائے اور انہوں
الصّٰلِحٰتِ	نے نیک اعمال کیے۔

(العصر - ۱۰۳ : ۳)

اور جہاں اس اجمال کی تفصیل مقصود ہے وہاں سب سے پہلے نماز کا ذکر آیا ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں
الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	نے بھلے کام کیے اور نماز کا اہتمام کیا۔

(البقرۃ - ۲ : ۲۷۷)

مذکورہ آیت میں تمام اعمالِ صالحہ کا عنوان نماز کو قرار دیا ہے۔ یہی حقیقت سورۂ حج

سے واضح ہوتی ہے :

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا	اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ اور اپنے
وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ	رب کی بندگی کرتے رہو۔

(الحج - ۲۲ : ۷۷)

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ	ہماری آیات پر تو بس وہی لوگ ایمان
اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا	لاتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان
وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ	کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ
وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ تَتَجَافٰى	سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد
جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ	ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے
خَوْفًا وَّطَمَعًا	ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف
(السجدۃ - ۳۲ : ۱۵ - ۱۶)	اور طمع سے۔

قرآن مجید میں اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔ ان آیتوں میں، ایمان و معرفت کا پہلا مظہر نماز کو قرار دیا گیا ہے۔ نماز اور ایمان کے درمیان کی کڑی شکر و محبت ہے، جو ایمان و معرفت کا پہلا فیضان اور پھر تمام شریعت کے سرچشمہ یعنی نماز کا اوّلین محرک ہے۔ نماز اور شکر کی باہمی مناسبت زیادہ محتاجِ تفصیل نہیں ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ نماز کی روح سورۂ فاتحہ ہے جو سراپا حمد و شکر کی سورہ ہے۔ پھر ایک سے زیادہ جگہوں میں نماز کو شکر ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے :

فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ	تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔
وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝	میری شکرگزاری کرتے رہنا، میری ناشکری
(البقرۃ - ۲ : ۱۵۲)	نہ کرنا۔

اس آیت میں "وَاشْكُرُوْا لِيْ" سے مراد فی الحقیقت نماز ہی ہے۔

نماز تمام شریعت کا سرچشمہ ہے :

جس طرح ایمان، شکر کے واسطے سے، نماز کا محرک ہے اسی طرح نماز کے واسطے سے بقیہ تمام شریعت کا محرک ہے۔ یعنی پہلے نماز وجود میں آتی ہے پھر وہ تمام شریعت کو وجود میں لاتی ہے۔

اس اجمال کو کسی قدر واضح لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ بندہ پر تمام حقوق، جیسا کہ معلوم ہے، دو قسم کے ہیں: ایک حقوق اللہ، دوسرے حقوق العباد۔ حقوق اللہ کا شیرازہ خدا کے ساتھ اخلاص اور اس کی شکرگزاری ہے اور حقوق العباد کا شیرازہ عدل اور احسان ہے۔ نماز ان دونوں کی جامع ہے۔ اس کے شکر ہونے کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ باقی رہا اس کا اخلاص ہونا تو اس کی نہایت واضح شہادت یہ ہے کہ ہر نماز کا آغاز اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا (الانعام - ٦ : ٧٩) (میں نے اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے) ہے جو اخلاص اور توحید کی ایک عظیم الشان آیت، بلکہ ایک عظیم الشان یادگار ہے۔

اسی طرح نماز کا عدل و احسان ہونا بھی ایک واضح حقیقت ہے۔ کیونکہ شکر و اخلاص کی بنیاد عدل و احسان ہی پر ہے۔ انسانی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو عدل کا شعور اور احسان کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے، یہ اسی کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے پروردگار کا مخلص اور صرف اسی کا شکرگزار ہو۔ ذیل کی آیات پر اس پہلو سے غور کیجیے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر جو عدل کا شعور ودیعت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کی نعمتوں کو اسی کی طرف منسوب کرے اور ان کے ملنے پر اسی کا شکر ادا کرے۔ یہ نہ کرے کہ نعمت تو کسی سے پائے اور شکرگزار کسی کا بنے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں برتری دے رکھی ہے

الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں تو کیا وہ اللہ کے فضل کا انکار کرتے ہیں۔

(النحل - ١٦ : ٧١)

مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکرگزار نہیں ہوتے۔

(یوسف - ١٢ : ٣٨)

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

اور جس طرح خدا نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو۔

(القصص - ٢٨ : ٧٧)

پس نماز ایک طرف بندہ کو خدا سے جوڑتی ہے، دوسری طرف مخلوق سے۔ اور شریعت کا اصل مقصود یہی ہے کہ بندہ خدا اور مخلوق، دونوں سے ٹھیک ٹھیک جڑ جائے۔ اسی وجہ سے قرآن میں ایمان کے دو مظہر برابر ساتھ ساتھ بیان ہوتے ہیں: ایک نماز، دوسرے زکوٰۃ۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

اور جنہوں نے نماز کا اہتمام کیا اور زکوٰۃ ادا کی۔

(البقرۃ - ٢ : ٢٧٧)

نماز حقوق اللہ کی بنیاد ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد کی۔ اور یہی دو ستون ہیں جن پر ساری شریعت قائم ہے۔ اور اگر زیادہ گہرائی میں اتر کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت نماز ہی ہے جس

سے زکوٰۃ بھی وجود میں آتی ہے، اس وجہ سے اصلاً شریعت کا سرچشمہ ایک ہی ہوا ہے۔
چنانچہ سورۂ مومنون میں تمام اعمالِ صالحہ کا سرچشمہ نماز ہی کو قرار دیا گیا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۙ الَّذِينَ	فائز المرام ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نماز میں
هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۙ	فروتنی اختیار کرنے والے اور جو لغویات
وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ	سے احتراز کرنے والے ہیں اور جو
مُعْرِضُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ	زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اپنی
لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۙ وَالَّذِينَ	شرمگاہوں کی حفاظت کرنے
هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۙ	والے ہیں۔

(المؤمنون - ۲۳ : ۱ - ۵)

شریعت کا قیام نماز پر منحصر ہے:

جب نماز شریعت کا سرچشمہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے قیام و بقا کے لیے نماز کا قیام و بقا ضروری ہوگا۔ سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو تمام انبیائے کرام کی دعوت کی بنیاد کی حیثیت سے ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین اٹھے
أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا	جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں
الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا	کے پیچھے پڑ گئے تو یہ لوگ عنقریب اپنی گمراہی
(مریم - ۱۹ : ۵۹)	کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

یہاں شہوات کی پیروی کو نمازیں ضائع کر دینے کے لازمی نتیجہ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فی الحقیقت نمازیں ضائع کر دینے کا لازمی نتیجہ ہے بھی یہی، کیونکہ فحشاء اور منکر سے روکنے والی چیز نماز ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ	بے شک نماز بے حیائی اور منکر
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ	سے روکتی ہے۔

(العنکبوت - ۲۹ : ۴۵)

جب یہ لگام نہ رہی تو نفسِ سرکش کو شہوات کی چراگاہ میں بڑھنے سے کون سی چیز روک سکتی ہے؟

ممکن ہے بعض لوگ نماز کی موجودہ بے اثری کی بنا پر اس بات پر حیران ہوں کہ نماز بے حیائی اور برائی کو کس طرح روکتی ہے۔ لیکن قرآن مجید میں یہ عظیم نتائج جن نمازوں سے وابستہ کیے گئے ہیں وہ ہماری موجودہ نمازیں نہیں ہیں۔ قرآن مجید اس قسم کے تمام اثرات و نتائج اس نماز سے وابستہ کرتا ہے جو شکر و محبت کے چشمہ سے ابلتی اور تمام شریعت کو وجود میں لاتی اور پھر اس کی نگہداشت کرتی ہے۔ یہ حقیقی نماز جو شخص پڑھے گا وہ شریعت کو ضائع نہیں کرے گا، بلکہ اس کو قائم کرے گا۔ کیونکہ اس نماز کی روح اللہ کی سچی یاد ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي	اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام
(طٰہٰ - ۲۰ : ۱۴)	رکھیو۔
وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۙ	اور اپنے خداوند کا نام یاد کیا اور نماز
(الاعلیٰ - ۸۷ : ۱۵)	پڑھی۔

گناہ اور معصیت کی رغبت، جیسا کہ معلوم ہے، غفلت اور خدا فراموشی کے سبب سے ہوتی ہے:

نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ۚ	جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو
(الحشر - ۵۹ : ۱۹)	خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا۔

اگر یادِ الٰہی موجود ہو اور اس اہتمام کے ساتھ کہ شب و روز کے تمام اوقات اس سے گھرے

ہوئے ہوں تو دل پر غفلت و نسیان کا میل کہاں سے آئے گا، اور اگر آئے گا تو ذکرِ الٰہی کی یہ نہرِ جاری جس کو نماز کہتے ہیں اس کو باقی کب رہنے دے گی؟

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ	جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی
طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ	شیطانی جھوٹ لاحق ہونے لگتی ہے
تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم	وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعۃً
مُّبْصِرُونَ	ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔

(الاعراف - ۷ : ۲۰۱)

نماز کی یہی حقیقت اس مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أرأيتم لو أن نهرًا	بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے
بباب أحدكم يغتسل	پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا
منه كل يوم خمس	ہو تو کیا اس کے جسم پر میل کچیل کا کوئی شائبہ
مرات، هل يبقى	باقی رہے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا: لاریب
من درنه شيء؟ قالوا:	میل کچیل کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہے گا تو
لا يبقى من درنه شيء.	آپ نے ارشاد فرمایا: یہی کچھ حال
قال: فذالك مثل الصلوات	پانچ نمازوں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے
الخمس يمحو الله بهن	ذریعے سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔
الخطايا[1]	

[1] صحیح مسلم: کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب المشی الی الصلوٰۃ تمحی به الخطایا و ترفع به الدرجات

پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نماز کی اصل حقیقت اللہ کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھنا ہے۔ مومن کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی یاد سے خالی نہیں ہونا چاہیے:

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا	جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر
وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ	خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

(آل عمران - ۳ : ۱۹۱)

دوسری جگہ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا	اے ایمان والو! تم اللہ کو بہت زیادہ
اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ	یاد کرو اور اس کی تسبیح کرو صبح و
بُكْرَةً وَأَصِيلًا	شام۔

(الاحزاب - ۳۳ : ۴۱-۴۲)

پس مومن صرف مسجد ہی میں نماز میں نہیں ہوتا ہے، بلکہ ہر آن اور ہر مکان میں وہ نماز میں ہوتا ہے، کیونکہ نماز کی اصل روح، یعنی ذکرِ الٰہی ہر لمحہ اس کے سینہ میں جلوہ گر رہتی ہے۔ وہ مسجد سے علیحدہ ہوتا ہے، لیکن خدا کی یاد سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتا؛ اور مسجد سے بھی جب علیحدہ ہوتا ہے تو یہ علیحدگی اس کے لیے کچھ راحت و لذت کی چیز نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا دل مسجد ہی میں رہتا ہے۔ 'مثل المؤمن كمثل الفرس في آخيته[1]' والی حدیث میں مومن کا تعلق مسجد سے وہی بتایا گیا ہے جو ایک گھوڑے کا اس کے تھان سے ہوتا ہے۔ جس طرح گھوڑا اپنے تھان سے بندھا بندھا کچھ جولانیاں بھی کر لیتا ہے اسی طرح مومن کا دل اٹکا ہوا تو ہوتا ہے مسجد کے ساتھ، لیکن وہ اپنے بشری تقاضوں کے تحت کچھ دنیا کے لیے بھی دوڑ دھوپ کر لیتا ہے: ؎

[1] مسند احمد بن حنبل: ج ۳، ص ۳۸

حافظ از عشق خط و خال تو سرگردان است
ہمچو پرکار و لے نقطۂ دل پا برجا ست

یہ ذکر دل سے غفلت و نسیان کے میل کو دھوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی پابندی سے قلب میں ایک نور و برہان پیدا ہو جاتا ہے، جو زندگی کی ہر منزل میں بندہ کی نگرانی کرتا ہے ہوائے نفس کی ظلمتیں جب نشانِ راہ گم کر دیتی ہیں یہ چمک کر راہ دکھا دیتا ہے۔ شہوات نے جہاں ٹھوکر کھلائی یہ نمودار ہو کر گرتے گرتے سنبھال لیتا ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں نماز کو نور و برہان کہا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نماز
ذکر الصلوٰۃ یومًا۔ فقال	کے متعلق فرمایا کہ جو شخص اس کی نگہداشت
من حافظ علیہا کانت	کرے گا وہ اس کے لیے روشنی اور
لہ نورا و برھانا ونجاۃ	برہان اور قیامت کے دن نجات کا
یوم القیامۃ [1]	ذریعہ ہوگی۔

ذکر الٰہی کی یہی برہانِ عظیم تھی جس نے ایک بڑی نازک گھڑی میں نمودار ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کو سنبھالا:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ	اور عورت نے تو اس کا قصد کر ہی لیا تھا وہ
بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ	بھی اس کا قصد کر لیتا اگر اس نے اپنے
رَبِّهٖ ۭ	رب کی واضح نشانی نہ دیکھ لی ہوتی۔

(یوسف - ۱۲ : ۲۴)

یہی راز ہے کہ نماز نے تمام شریعت کے لیے ایک دائرہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل: ج ۲، ص ۱۶۹

یعنی اللہ تعالیٰ نے نماز کا ایک دائرہ کھینچ کر تمام شریعت کو اس کے اندر محفوظ کر دیا ہے جب تک کوئی شخص اس دائرہ کو محفوظ رکھتا ہے اس کا دین و اخلاق محفوظ رہتا ہے، اور جہاں اس حصار میں کوئی رخنہ پیدا ہوا، شیطان شہوات کی فوج لے کر چڑھ دوڑتا ہے اور اس کے سارے دین و اخلاق کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

سورہ مومنون کی ان آیات پر غور کیجیے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ	فائز المرام ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی
الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ	نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے اور
خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	لغویات سے احتراز کرنے والے ہیں اور
لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ	جو زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اپنی شرمگاہوں
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ	کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں
اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ	اور لونڈیوں کے جن تک سو اس بارے میں
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ	ان کو کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو ان کے
مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى	سوا کے خواہش مند ہوئے تو وہی
وَرَاۗءَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ	ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں اور
الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ	جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس
رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں
عَلٰي صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ	کی حفاظت کرتے ہیں۔

(المؤمنون - ۲۳: ۱-۹)

یہاں جتنی نیکیاں بیان ہوئی ہیں ان کا آغاز بھی نماز سے ہوا ہے اور پھر ان کا اختتام بھی نماز ہی پر ہوا ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شریعت کی حفاظت نماز کی حفاظت و نگہداشت پر منحصر ہے۔ پھر شروع میں نماز کے ساتھ خشوع کا ذکر کیا جو اظہار

بہیمیت کی علامت اور نماز کی روح ہے، اور آخر میں محافظت کا ذکر کیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جو نماز فلاح و سعادت کی ضامن ہے اس کی روح خشوع اور اس کی خصوصیت مداومت ہے۔ یہی بات سورۂ بقرہ میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ بھی نماز سے شروع ہوتی ہے:

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ	ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے
يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ	لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ۔	رہتے اور ایمان لاتے ہیں اور نماز
(البقرة - ۲ : ۲-۳)	قائم کرتے ہیں۔

پھر تمام قوانین واحکام کے خاتمہ پر یہ آیت آتی ہے:

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ	نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور
وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ق وَقُوْمُوْا	پر بیچ کی نماز کی اور نمازوں میں
لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ٥	خدا کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو۔
(البقرة - ۲ : ۲۳۸)	

اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارے دین کا آغاز بھی نماز سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام بھی نماز پر ہوتا ہے، اور درحقیقت نماز ہی ہے جو تمام شریعت کی محافظ ہے۔

نماز ہی حقیقی زندگی ہے:

نماز حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ سورۂ کوثر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"نماز سانس کی طرح زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ حقیقی زندگی جو نور، سکینت اور ایمان کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے، صرف اللہ کی یاد ہی سے باقی رہ سکتی ہے۔ غور کرو تو عقلاً یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بندوں کو عقل وتمیز اور ہر قسم کی

صلاحیت دے دینے کے بعد خدا کی نظرِ التفات اس وقت تک ان کی طرف متوجہ نہیں ہونی چاہیے جب تک وہ اپنی توجہ اور اپنی نیازمندی سے اس کو دعوت نہ دیں۔ اس کا دستور یہ ہے کہ جب بندہ شکر کرتا ہے اور پائی ہوئی نعمتوں کو صحیح طور پر کام میں لاتا ہے تو وہ نعمت کو زیادہ کرتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ	اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار
هُدًى ۔	کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی
(محمد - ۴۷ : ۱۷)	بخشی۔

خدا کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نام کی یاد کی جائے۔ خدا سے تقرب حاصل کرنے کی راہ یہی ہے۔ اس کی قربت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کی یاد تازہ رہے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اس سے قریب ہو جاتا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ السجدة	اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔
(العلق - ۹۶ : ۱۹)	

اس وقت اللہ کی نظرِ رحمت اس کو نوازتی ہے، اس کا سینہ نورِ معرفت سے جگمگاتا ہے، کیونکہ روح ذکر وفکر کی گہرائیوں میں جس قدر اترتی ہے زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر معمور ہوتی جاتی ہے۔ صحیح بخاری کی مندرجہ ذیل حدیث میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے:

وما يزال عبدى يتقرب	میرا بندہ نوافل کی راہ سے میری طرف
الىّ بالنوافل ۔ حتىٰ أحبّه	بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس
فاذا احببته كنت سمعه	کو محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں اس
الذى به يسمع وبصره	کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں

الذی یبصر ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی یمشی بہا[1]

جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

یہ اسی روحانی زندگی کا بیان ہے جو حقیقی اور واقعی زندگی ہے۔

اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ حقیقی زندگی کا سرچشمہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں نبی کی دعوت کو زندگی کی دعوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (الانفال - ۸ : ۲۴)

اے ایمان والو! اللہ و رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی دعوت دے رہا ہے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔

بعینہٖ یہی بات حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی فرمائی ہے کہ "آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا، بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے[2]"۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ آیات میں وحی کو رزق کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ یہی رزق حقیقی زندگی اور حقیقی قوت کا سرچشمہ ہے۔ جو لوگ اس رزق سے آسودہ ہیں وہ مر کے بھی زندہ رہتے ہیں:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ (البقرۃ - ۲ : ۱۵۴)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں۔

---

[1] صحیح البخاری، باب ماجاء فی الرقاق "وان لا عیش الا عیش الآخرۃ"

[2] انجیل متی: باب ۴ : ۴

اور جو رزق سے محروم ہیں ان پر زندگی میں بھی موت طاری رہتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ان کے لیے "اَلْاَمْوَاتُ" (فاطر - ۳۵ : ۲۲) (مردہ)، "فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" (البقرۃ - ۲ : ۱۰) (مرض القلب)، "شَرَّ الدَّوَآبِّ" (الانفال - ۸ : ۲۲) (بدترین جانور)، "خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ" (المنافقون - ۶۳ : ۴) (لکڑی کے کندے) وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے اور ایسے دس آدمیوں کو شکست دینے کے لیے ایک مرد مومن کی قوت کو کافی قرار دیتا ہے:

اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ (الانفال - ۸ : ۶۵)

اگر تمہارے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے۔

اور ہمارے مشہور فلسفہ قلت و کثرت سے بالکل الگ ہو کر اس کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے:

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ (الانفال - ۸ : ۶۵)

یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ بصیرت سے محروم ہیں۔

جن لوگوں کے دل سمجھ سے محروم ہیں، قرآن ان کو چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف - ۷ : ۱۷۹)

ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔

یعنی چونکہ وہ فہم و بصیرت کی روشنی سے محروم ہیں، اس وجہ سے ان کے دماغوں کانوں اور آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ اسی عالم آب و گل کی رغبات و شہوات میں گرفتار ہیں۔ وہ زمین کے کیڑوں کی طرح ہمیشہ ذلت کی خاک چاٹتے اور کتوں کی طرح ہمیشہ کسی ہڈی کی تلاش میں دوڑتے رہتے ہیں:

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۔	اور ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔

(النجم - ۵۳ : ۳۰)

ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے، اس سے آگے کسی عالم کا وہ تصور نہیں کرسکتے۔ اس سے آگے کا عالم، جو حقیقی عالم ہے، آیات اللہ کی بخشی ہوئی روشنی سے نظر آتا ہے۔ جو اس روشنی کو قبول کر لیتے ہیں وہ اس عالم کو دیکھتے ہیں اور وہ اس کی کامیابیوں کے آگے اس دنیا کی کامیابیوں کو ہیچ سمجھتے ہیں اور ساری جدوجہد اس کے حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن جو اس روشنی کو نہیں قبول کرتے، ان کو شیطان اسی زمین کی دلدل میں بھٹکاتا اور ٹھوکریں کھلاتا رہتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ	اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے، لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھک گیا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بن رہا۔ تو اس کی

تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ	تمثیل کتے کی ہے۔ اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

(الاعراف - ۷ : ۱۷۵-۱۷۶)

اس تفصیل کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اصلی زندگی دل کی زندگی ہے اور دل کی زندگی صحیح فہم و بصیرت سے پیدا ہوتی ہے اور صحیح فہم و بصیرت کا سرچشمہ اللہ کی آیات ہیں۔

اب آپ نماز کی حقیقت پر غور کیجیے۔ نماز کا اصل مقصد اللہ کی آیات پر تدبر و تفکر ہے، جو صحیح فہم و بصیرت یا حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ تمام عبادات میں نماز اس مقصد کے لیے مخصوص ہے۔ ابتدائے بعثت میں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بارِ گراں کے تحمل کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، اس حقیقی زندگی سے معمور کرنے ہی کے لیے آپ کو نماز کا حکم دیا گیا اور اس کے ایسے آداب و قواعد تعلیم کیے گئے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا اصل مقصد آیاتِ الٰہیہ پر تدبر ہے تاکہ قلب فہم و بصیرت کے انوار سے معمور ہو جائے:

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝	رات میں قیام کرو مگر تھوڑا حصہ۔ آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کردے، یا اس پر کچھ زیادہ کرلے، اور قرآن کی تلاوت کر ٹھہر ٹھہر کر۔ ہم تم پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات میں اٹھنا دل جمعی اور فہم کلام کے لیے نہایت خوب ہے۔

(المزمل - ۷۳ : ۲-۶)

ان آیات سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں :

۱۔ یہ تہجد کی نماز ہے جس میں قیام و قراءت کو طویل ہونا چاہیے۔

۲۔ قرآن میں سے جو کچھ پڑھا جائے، لفظ لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر، خوب سمجھ کر، پڑھا جائے۔

۳۔ یہ نماز انسان کو حقیقی زندگی اور قوت سے معمور کر کے مہماتِ دعوت و نبوت کے لائق بناتی ہے۔

۴۔ اس کا وقت شب کے پچھلے پہر کا وقت ہے، جب کہ آدمی کو نہایت اطمینان بخش اور سکون پرور تنہائی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ تدبر و تفکر جو اصل مقصود ہے، اس کے لیے سب سے زیادہ سازگار ساعت یہی ہے : ؎

شرحِ مجموعۂ گل مرغِ سحر می داند
کہ زہر کو ورقے خواند معانی دانست

اس موقع وہ مشہور حدیثِ قدسی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پچھلے پہر کو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر آکر توبہ اور استغفار کرنے والوں کی دعا اور استغفار کا انتظار کرتا ہے ذہن میں رہنی چاہیے۔ نیز صحیح بخاری کی وہ حدیث بھی جو تقرب سے متعلق اوپر گزر چکی ہے اور وہ تمام تفصیلات بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شب کی نمازوں کے متعلق، احادیثِ صحیحہ میں وارد ہیں، اور جو اس آیتِ کریمہ کی عملی تفسیر ہیں :

انہی وجوہ سے قرآن مجید میں نماز کو صاف صاف 'حیات' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے :

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ	بے شک میری نماز، اور میری قربانی
وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ	میری زندگی اور میری موت اللہ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ	رب العالمین کے لیے ہے۔

(الانعام - ۶ : ۱۶۲)

اس آیت میں، تقابل کے اصول کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں 'مَحْیَایَ' کا لفظ جس کے معنی زندگی کے ہیں 'صَلٰوۃ' کی تفسیر ہے اور 'مَمَات' جس کے معنی موت کے ہیں 'نُسُک' یعنی قربانی کی تفسیر ہے۔

نماز مشکل کشا ہے :

نماز کی مذکورہ بالا حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں رہا کہ نماز تمام پریشانیوں سے نجات دینے والی اور تمام مشکلوں کو دور کرنے والی چیز ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے :

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی
علیہ وسلم اذا حزبہ امر صلّٰی[1]	مشکل پیش آتی تو آپ نماز پڑھتے۔

بعینہٖ یہی بات قرآن مجید سے بھی نکلتی ہے۔ مکہ کی پُر مصائب زندگی میں جب مخالفینِ اسلام کی دل آزاریوں اور اشرار کی شرارتوں سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملول و آزردہ ہوتے تو آپ کو صبر و استقامت کی تلقین کی جاتی اور اس صبر و استقامت کے حصول کے لیے نماز کا حکم دیا جاتا :

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ	تو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ	رب کی تسبیح کرتے رہو، اس کی حمد
طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ	کے ساتھ، سورج کے طلوع اور
الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّیْلِ	اس کے غروب سے پہلے اور رات
فَسَبِّحْہُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ	میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے
(قٓ - ۵۰ : ۳۹ - ۴۰)	ڈھلنے کے بعد بھی۔

[1] مسند احمد بن حنبل : ج ۱، ص ۲۰۶

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ	اور تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ
فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ	کا انتظار کرو۔ بے شک تم ہماری آنکھوں
رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ	میں ہو۔ اور اپنے رب کی تسبیح کرو اس
(الطور - ۵۲ : ۴۸)	کی حمد کے ساتھ، جس وقت تم اٹھتے ہو۔

مکی سورتوں میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔

اب غور کیجیے نماز میں ایسی کیا چیز ہے جس کے نتائج و ثمرات یہ ہو سکتے ہیں۔

رنج و غم کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ چیز دراصل زیادہ تر نتیجہ ہے اس بات کا کہ آدمی کو یا تو تقدیر پر مضبوط عقیدہ نہیں ہوتا یا مشکلات و مصائب کے ہجوم میں یہ عقیدہ نگاہوں سے اوجھل ہو جایا کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:

مَآ أَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ	اور تمہیں کوئی مصیبت بھی نہیں پہنچتی
فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيْٓ أَنْفُسِكُمْ	ہے، نہ زمینی پیداوار میں اور نہ تمہارے
إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ	اپنے نفوس کے اندر، مگر یہ کہ وہ لکھی ہوئی
نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذٰلِكَ	ہے ایک کتاب میں اس سے پہلے
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا	کہ ہم اس کو وجود میں لائیں اور یہ اللہ کے
تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ	لیے نہایت آسان ہے۔ یہ بات تمہیں اس
وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۗ	لیے بتائی جا رہی ہے کہ جو چیز جاتی رہے
(الحدید - ۵۷ : ۲۲-۲۳)	اس پر غم نہ کرو اور نہ اس چیز پر اتراؤ جو اس
	نے تمہیں بخشی ہے۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ جو لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان کو مالی اور جانی، جو آفتیں بھی پیش آتی ہیں، سب ایک حکیم و رحیم خدا کے حکم سے آتی ہیں

اور صحیفۂ تقدیر کے نوشتہ کے مطابق آتی ہیں، وہ نہ کسی آفت سے پریشان و مایوس ہوتے اور نہ کسی نعمت پر مغرور و متکبر ہوتے۔

چونکہ اس علم و عقیدہ کے لحاظ سے لوگوں کے حالات مختلف درجہ کے ہوتے ہیں اس وجہ سے مشکلات و مصائب کے مقابلہ میں مختلف اشخاص کا مختلف حال ہوتا ہے۔ ایک شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ پہاڑوں اور سمندروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور دوسرا ایک پرکاہ سے بھی لرزتا ہے اور کانپتا ہے:

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم — گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

وہ بھی انسان ہی تھے جن کی بابت کہا گیا:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	بے شک اللہ نے اہل ایمان سے ان کے
أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ	جان و مال ان کے لیے جنت کے عوض
لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُوْنَ	خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ	جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں
وَيُقْتَلُوْنَ ۖ	اور مرتے بھی ہیں۔

(التوبۃ - ۹ : ۱۱۱)

اور وہ بھی یقیناً انسان ہی تھے جن کی حالت یہ بیان کی گئی ہے:

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ	وہ ہر خطرہ اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں۔ اصل
هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ	دشمن وہی ہیں، پس ان سے بچ کے رہو۔

(المنٰفقون - ۶۳ : ۴)

انسانوں کی ایک ہی جنس میں، یہ فرق و اختلاف محض علم صحیح کے عدم و وجود نے پیدا کر دیا ہے۔ جو حقیقی علم کی روشنی سے فیض یاب ہیں وہ کبھی رائی کو پہاڑ نہیں سمجھتے، وہ نفس مطمئنہ کی کائنات کے فرمانروا اور اقلیم طمانیت کے تاجدار ہوتے ہیں اور یہ مقام ان کو نماز کی برکت

سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ، جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، علمِ صحیح کا سرچشمہ نماز ہے۔

ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ رنج و غم اللہ سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کی معیت حاصل رہے تو کوئی پریشانی پاس نہیں پھٹک سکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عالم میں فرمایا ہے:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۚ — تم غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

(التوبۃ - ۹ : ۴۰)

خدا کے قرب ہی کی وجہ سے اہلِ جنت کا حال یہ ہوگا کہ:

لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ — ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(یونس - ۱۰ : ۶۲)

اور دنیا میں خدا سے اس قربت کے حاصل کرنے کا ذریعہ صرف نماز ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ — اور سجدہ کر اور قریب ہوجا۔

(العلق - ۹۶ : ۱۹)

سورۂ بقرہ میں ہے:

اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ — ثابت قدم رہو اور نماز سے مدد چاہو۔

(البقرۃ - ۲ : ۱۵۳)

اور سورۂ اعراف میں ہے:

اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا — اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔

(الاعراف - ۷ : ۱۲۸)

ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے: پہلی آیت میں "صلوٰۃ" کا لفظ ہے اور دوسری آیت میں بالکل اسی جگہ پر "اللہ" کا لفظ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز خدا سے اس درجہ

قریب ہے کہ وہ دنیا میں گویا ہمارے لیے خدا کی قائم مقام ہے۔ جب ہم ہر طرف سے منقطع ہو کر نماز میں کھڑے ہو جاتے ہیں تو گویا اپنے اس رب کی پناہ میں چلے جاتے ہیں جس کا نام سلام (سکھ) ہے۔ سورۂ مزمل کی اس آیت پر غور کیجیے۔ اس میں محبت و رأفت کا کیسا جاں نواز پیام ہے:

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا ۝ — اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف گوشہ گیر ہو جا۔

(المزمل - ۷۳ : ۸)

اسی وجہ سے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ بندہ نماز میں اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے:

ان احدکم اذا صلی یناجی ربہ [1] — تم میں سے جب کوئی نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔

اور اسی مقام کی کیفیات ہیں جو ان الفاظ سے بیان ہوئی ہیں:

یا بلال! اقم الصلوٰۃ ارحنا بہا [2] — اے بلال! نماز کے لیے تکبیر کہو اور ہم کو اس کے ذریعے راحت دو۔

جُعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ [3] — میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

اس کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ نماز، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، ذکرِ الٰہی ہے اور ذکر

---

[1] صحیح البخاری: کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۸

[2] سنن ابی داؤد: کتاب الادب، باب فی صلوٰۃ العتمۃ

[3] سنن النسائی: کتاب عشرۃ النساء، باب ۱

اسی اطمینانِ قلب کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۝	سن لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

(الرعد - ۱۳ : ۲۸)

اطمینان کا مفہوم یہ ہے کہ ذکر و فکر اور علم صحیح کی حکمت سے قلب کے نور کا یہ حال ہو جائے کہ رنج و راحت کے تمام انقلابات میں اس کی لو یکساں رہے۔ یہی "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ" (المآئدۃ - ۵ : ۱۱۹) (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) کا مقام ہے۔ اور اسی چیز کا ذکر سورۂ فجر میں ہے:

يٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً	اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔

(الفجر - ۸۹ : ۲۷ - ۲۸)

اور یہ مقام صرف نمازیوں کے لیے مخصوص ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝	انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا جانے والا ہے اور جب اس کو کشادگی حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ صرف نمازی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ جو نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں۔

(المعارج - ۷۰ : ۱۹ - ۲۳)

نماز فطرتِ کائنات ہے:

تمام کائنات خدا کے حکم سے وجود میں آئی ہے اور اس کی مشیت و حکمت نے جو نقشۂ عمل اس کے لیے ٹھہرا دیا ہے اسی پر چل رہی ہے۔ کوئی ذرہ اس نقشہ سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا۔ زمین و آسمان اس کے تابع فرمان ہیں۔ سورج اور چاند سب اس کے بنائے ہوئے مستقر اور اس کی ٹھہرائی ہوئی منزلوں میں دوڑ رہے ہیں۔ ہوا اور پانی اس کے حکموں کے آگے سرفگندہ ہیں۔ چرند و پرند اس کی حمد و تسبیح میں زمزمہ سنج ہیں:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ	ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

(بنی اسرآئیل - ۱۷ : ۴۴)

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُونَ ۝ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ السجدة	کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے اس کے سائے دہنے اور بائیں سے منقلب ہوتے ہیں اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور ان پر فروتنی ہوتی ہے اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی، وہ سرتابی نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔

(النحل - ۱۶ : ۴۸ - ۵۰)

تمام کائنات کی یہ ہم آہنگی و یک جہتی انسانی فطرت کو دعوت دیتی ہے کہ جب سب اس کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں تو وہ بھی اس کی بندگی کے لیے کمربستہ ہو۔ جب زمین کے جانوروں، جنگل کے درختوں، فضا کی چڑیوں، سمندر کی مچھلیوں اور آسمانوں کے تاروں میں سے کوئی اس سے باغی نہیں ہے تو انسان، جو اشرف المخلوقات ہے، اس سے کیوں بغاوت کرے! تمام کائنات کی فطرت میں توافق ہے، یہ پورا ساز نغمہ ریز ہے، پھر انسانی فطرت کا ساز کیوں خاموش رہے! اس بزم میں وہ اپنا نغمہ بھی کیوں نہ چھیڑے کہ تمام کائنات حمد و تسبیح کے ترانوں سے گونج اٹھے۔

جو فطرت صالح ہے وہ کائنات کی اس دعوت کو یہ کہہ کر قبول کر لیتی ہے:

وَمَالِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي	اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا۔
(یٰسٓ - ۳۶ : ۲۲)	

لیکن جو فاسد ہو چکی ہے وہ اس سے اعراض کرتی ہے:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۙ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۙ	پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا۔
(القیٰمۃ - ۷۵ : ۳۱ - ۳۲)	

قرآن مجید نے یہ پوری داستان صرف ایک آیت میں اس طرح بیان کر دی ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ	کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے۔ اور بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے۔
(الحج - ۲۲ : ۱۸)	

چونکہ نماز تمام کائنات کی فطرت ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے، اس وجہ سے اسلام کا ستون نماز قرار پائی ہے۔ پس جو شخص نماز کو ڈھا دے گا، وہ پورے دین کو ڈھا دے گا اور جو شخص اس کو استوار کرے گا وہ پورے دین کو استوار و محکم کرے گا۔ 'اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ' (نماز دین کا ستون ہے) کہہ کر یہی حقیقت آشکارا کی گئی ہے۔

نماز قوموں کے لیے عدالت ہے:

اس مقام تک پہنچ جانے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ نماز قوموں کے لیے عدالت ہے۔ یعنی قوموں کے عزل و نصب میں اصل عامل درحقیقت نماز ہی ہے۔ جو قوم نماز قائم کرتی ہے فلاح پاتی ہے، جو نماز سے غفلت کرتی ہے وہ انجام کار تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہوگی، لیکن پچھلے مباحث اگر نظر کے سامنے ہوں تو تھوڑے سے تأمل کے بعد سمجھ میں آ سکتی ہے۔

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ نماز تمام کائنات کی فطرت ہے، اس وجہ سے جو شخص نماز سے اعراض کرتا ہے، وہ ایک طرف تو خود اپنی فطرت کے خلاف رویہ اختیار کرتا ہے، دوسری طرف ساری کائنات سے الگ ہو کر وہ اپنی ایک جدا راہ نکالتا ہے جس میں کوئی اس کا ہم سفر نہیں ہے، نہ سورج، نہ ہوا، نہ آسمان، نہ زمین، نہ حیوانات، نہ فرشتے۔ اور اس طرح وہ اس ہم آہنگی کو درہم برہم کر رہا ہے جو اس کائنات میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ ساز ہستی سے جو نغمہ بلند ہو رہا ہے، اس میں اپنی آواز ملا کر اس کو بلند کر دے۔ بلکہ اپنے تنہا سُر سے ایک الگ نغمہ ترکیب دینا چاہتا ہے۔ وہ سمندر بن کر نہیں قطرہ بن کر جینا چاہتا ہے۔ کیا ایسا وجود فلاح پا سکتا ہے، اگر شاخ تنے

سے الگ ہو کر خشک ہو جاتی ہے اور گلّہ سے الگ ہو جانے والی بھیڑ کو بھیڑیا کھا جاتا ہے تو اس وجود کی تباہی میں کیوں شبہ کیا جائے جو بیابان کے درخت کی طرح اکیلا اور زندگی و بقا کے تمام وسائل سے محروم ہے! سورۂ حج والی آیت جو اوپر گزر چکی ہے۔ ایک مرتبہ پھر غور سے پڑھیے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ	کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے
لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ	میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ،
وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ	درخت اور چوپائے اور لوگوں میں بہتیرے
وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ	اور بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا
كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ	کا عذاب لازم ہو چکا ہے۔
حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ	

(الحج - ۲۲ : ۱۸)

اس آیت کے آئینہ میں تمام کائنات خدا کے سامنے سربسجود نظر آتی ہے۔ سورج اور چاند، دریا اور پہاڑ، شجر و حجر، چرند و پرند، سب اس کے عرشِ عزت و جلال کے آگے سرنگندہ ہیں۔ ایک وجود بھی اس سے منحرف نہیں۔ تمام مخلوقاتِ الٰہی کی زبانوں پر ایک ہی ترانہ اور ایک ہی کی حمد ہے۔ انسانوں میں سے، جن کی فطرت صالح ہے، وہ بھی اس بزم میں شریک ہیں: "وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ" سورج جب خدا کے سامنے سر جھکا دیتا ہے، وہ بھی اس کے حضور صفیں باندھ کر سجدوں میں گر جاتے ہیں: "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ" (بنی اسرآئیل - ۱۷ : ۷۸) (نماز کا اہتمام رکھو زوالِ آفتاب کے اوقات سے لے کر) ستارے جب اپنے خالق کے سامنے سرنگندہ ہوتے ہیں، وہ بھی اپنے بستروں سے اٹھ کر، اپنی جبینِ نیاز اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں:

"وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ" (ق - ۵۰ : ۴۰) (اور رات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے ڈھلنے کے بعد بھی)۔ اور چونکہ انسان ذی ارادہ اور تمام کائنات سے اشرف و اعلیٰ ہے، اس وجہ سے وہ جب چاہتا ہے تو اس شان سے حمدِ الٰہی کا نغمہ چھیڑتا ہے کہ اگر زمین کے غافل انسان اس کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ فضا کی چڑیوں کو شریکِ بزم کر لیتا ہے۔ اور اگر سنگ دل آدمیوں کو اس کی رفاقت سے انکار ہوتا ہے تو وہ پہاڑوں کو ہم نوا بنا لیتا ہے، کیونکہ خدا کی تمام مخلوقات میں سرکش انسانوں کے سوا اس کی حمد و تسبیح سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ	ہم نے اس کے ساتھ پہاڑوں کو لگا دیا
مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ	جو شام و صبح اس کے ساتھ تسبیح کرتے
وَالْاِشْرَاقِ ۙ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً	اور پرندوں کو بھی، جھنڈ کے جھنڈ —
كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝	سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

(ص - ۳۸ : ۱۸ - ۱۹)

یہی انسان کامیاب ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝	فائز المرام ہوئے وہ اہلِ ایمان جو
الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ	اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار
خٰشِعُوْنَ ۝	کرنے والے ہیں۔

(المؤمنون - ۲۳ : ۱)

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں، تمام کائنات سے کٹ کر نہیں رہنا چاہتے، بلکہ گھرانے کے فرد اور مجموعۂ کائنات کے ایک عضو کی طرح جینا چاہتے ہیں۔ وہ اس کل کے ایک جزو اور اس سمندر کے ایک قطرہ ہیں، اس وجہ سے زمین اور آسمان،

دونوں کو ان سے محبت ہوتی ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز ان کو پیار کرتی ہے۔ زمین ان کے لیے غلہ اگاتی ہے، بادل ان کے لیے پانی برساتے ہیں، ہوائیں ان کی فصلیں پکاتی ہیں، سورج ان کو گرمی پہنچاتا ہے، چاند ان کو شمع دکھاتا ہے، ستارے ان کی رہبری کرتے ہیں۔ وہ تمام کائنات سے محبت کرتے ہیں، اس وجہ سے تمام کائنات ان سے محبت کرنے لگتی ہے۔ وہ خدا کو محبوب ہو جاتے ہیں، اس لیے خدا اپنی تمام مخلوق کو حکم فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرے۔ اسی وجہ سے فرمایا:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا	اور اگر اہلِ کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ
وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ	اختیار کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ	جھاڑ دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں
النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا	میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل
التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ	اور اس چیز کو قائم کرتے جو ان کی طرف
اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ	ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تو
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ	وہ اپنے اوپر سے اور قدموں کے نیچے سے
تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ	خدا کا رزق و فضل پاتے۔

(المآئدۃ - ۵ : ۶۵ - ۶۶)

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہاں زمین و آسمان کی نعمتوں کے فتح باب کو اللہ تعالیٰ نے تورات و انجیل کے قائم کرنے کے ساتھ مشروط کیا ہے، یہاں نماز کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور ہماری بحث کا تعلق نماز کی برکات و نتائج سے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اقامتِ کتاب یا اقامتِ تورات و انجیل یا اس سے زیادہ وسیع لفظوں میں، اقامتِ شریعت کا انحصار اقامتِ نماز ہی پر ہے۔ کتابِ الٰہی کے طرزِ کلام کو جو لوگ جانتے ہیں وہ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اگر یہاں 'اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ

الْاِنْجِيْلَ' کی بجائے صرف 'اَقَامُوا الصَّلٰوةَ' ہی کے لفظ ہوتے تو گو الفاظ بدل جاتے، لیکن حقیقت میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔ اس بحث کو ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اقتضائے مقام سے چند اشارات ضروری ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ	اور جو لوگ کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا	اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم مصلحین کا
لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝	اجر ضائع نہیں کریں گے۔

(الاعراف - ۷ : ۱۷۰)

اس آیت میں تمسک بالکتاب کی علامت صرف اقامتِ نماز کو قرار دیا ہے یعنی جو جماعت نماز پر صحیح طور سے قائم ہے وہ اپنی کتاب پر قائم ہے، اس کا اجر ضائع نہ ہو گا۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اضاعتِ صلوٰۃ کو تمام شریعت کی بربادی کا پیش خیمہ قرار دیا:

اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا	جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں
الشَّهَوٰتِ	کے پیچھے پڑ گئے۔

(مریم - ۱۹ : ۵۹)

سورۂ مائدہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اس عہد کا ذکر فرمایا ہے، جو یہود سے پابندیٔ شریعت کے متعلق لیا گیا ہے، وہاں کتاب یا تورات کا لفظ نہیں رکھا، بلکہ صرف اقامتِ صلوٰۃ کا رکھا ہے۔ اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نماز پر پابندی کے ساتھ قائم رہنے کے معنی یہ ہیں کہ پورا عہد مضبوط و استوار ہے اور نماز کے کمزور ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ سارا عہد و میثاق ڈھیلا ڈھالا اور کمزور ہو گیا ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ	اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ	اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مامور
اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَقَالَ	کیے اور اللہ نے ان سے وعدہ کیا کہ

اللہ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ (المآئدۃ - ۵ : ۱۲)	میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز کا اہتمام رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے۔

تاہم اگر ان تصریحات کے بعد کسی کو پورا اطمینان نہ ہو تو سورۂ اعراف کی یہ آیت، نماز کے نتائج کے باب میں، بالکل غیر مشتبہ ہے:

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۟ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الاعراف - ۷ : ۱۲۸)	موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کو اس کا وارث بناتا ہے اور انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔

اس آیت میں ابتدائی حصہ بعینہٖ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ (البقرۃ - ۲ : ۱۵۳) (اے ایمان والو ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو) کے ہم معنی ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں 'اللہ' کا لفظ ہے اور اس میں 'الصّلوٰۃ' کا لفظ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، ان دونوں لفظوں سے ایک ہی حقیقت تعبیر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ نماز ہے پس ایک آیت میں ذریعہ کو بتا دیا، دوسری آیت میں مقصود کو۔

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ جو جماعت نماز قائم کرتی ہے وہ تمام کائنات کے ساتھ متحد اور ہم آہنگ ہے، اس وجہ سے اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا ساتھی اور رفیق ہے۔ زمین اور آسمان اور ان کے مابین جو کچھ ہے، سب کے ساتھ اس کا رشتہ قائم ہے۔ اور چونکہ اس پورے گھرانے میں ارادہ و اختیار رکھنے والی مخلوق تنہا وہی ہے، اس لیے

سے اس کی سیاست کی باگ اسی کے ہاتھوں میں دی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے جو جماعت نماز سے اعراض کر لیتی ہے، وہ تمام کائنات سے اپنا رشتہ کاٹ لیتی ہے۔ زمین و آسمان کے ساتھ اس کا اتحاد باقی نہیں رہ جاتا، پس قدرت کے قانون کے مطابق زمین سے اس کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے، کیونکہ وہ کنبہ کے تعاون سے محروم ہو چکی ہے، جو زندگی اور بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

اس مقام پر ایک لمحہ توقف کر کے اس حقیقت کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ افراد و اقوام کو جو کچھ بخشتا ہے، ان کی صلاحیت اور استعداد کے پیمانے سے ناپ کر بخشتا ہے۔ اس قانون کا نام قرآن کی بولی میں 'سنت اللہ' ہے۔ یہ سنت اللہ اس پورے کارخانۂ خلق و ایجاد میں ایسی ہمہ گیری کے ساتھ جاری و نافذ ہے کہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ قرآن کے علاوہ دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حکومت اور خلافت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم الشان نعمت ہے۔ یہ کسی قوم کو اس وقت بخشی جاتی ہے جب وہ اس کے لیے استعداد و صلاحیت رکھتی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے سیادت و امامت کے منصب عظیم پر سرفراز فرمانا چاہا تو پہلے ان کی اہلیت و استعداد کا امتحان لیا اور جب وہ تمام امتحانوں میں پورے اترے تو ان کو امامت پر سرفراز فرمایا۔

یہ استعداد دو مختلف پہلوؤں سے جانچی جاتی ہے: ایک یہ کہ یہ مقاصد سیاست و حکمرانی کے مطابق ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ اس کی مقدار کتنی ہے۔ اگر یہ صلاحیت مقاصد حکومت کے لیے موزوں ثابت ہوتی ہے تو اس کی مقدار کے لحاظ سے چھوٹی یا بڑی حکومت عطا ہوتی ہے۔ اگر صلاحیت محدود ہوتی ہے، حکومت بھی محدود ہوتی ہے اور اگر صلاحیت غیر محدود ہوتی ہے تو حکومت بھی عالمگیر ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے جو ادیان و ملل تھے،

وہ قوموں اور جماعتوں کے اندر محدود رہے کیونکہ ان کی صلاحیت عالمگیر سیادت کے لیے کافی نہ تھی۔ لیکن امّتِ مرحومہ کو جو خلافت بخشی گئی اس نے زمین کے تمام کناروں کو اپنے احاطہ میں لے لیا: ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اب یہیں ایک اور مسئلہ پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ خلافت کے لیے کسی جماعت میں کس قسم کی صلاحیت ہونی چاہیے تاکہ صلاحیت کی نوعیت کا سوال طے ہو جائے۔ اس سوال کا جو جواب مشہور مورخ اور حکیم، علامہ ابنِ خلدون نے دیا ہے، ہمارے نزدیک بالکل قرآن کے مطابق ہے۔ اس وجہ سے ہم اس کے جواب کو، اسی کے الفاظ میں، یہاں نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"چونکہ انسان مدنی الطبع ہے، اس وجہ سے حکومت اس کے لیے ایک فطری چیز ہے۔ اور انسان بمقابلہ شر کے خیر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ اس کی اصل فطرت اور قوتِ ناطقہ دراصل خیر ہی کو چاہتی ہے، شر صرف اس کے قوائے حیوانی کا نتیجہ ہے۔ بحیثیت انسان اس کو خیر اور خصائلِ خیر ہی محبوب ہیں۔ پھر حکومت و سیادت چونکہ اس کو انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے، کیونکہ یہ انسان کے خواص میں سے ہے نہ کہ حیوان کے خواص میں سے، اس لیے حکومت و سیاست کے لیے خصائلِ خیر ہی موزوں ہو سکتے ہیں۔

"سیاست اور حکومت دراصل مخلوقِ الٰہی کی کفالت اور بندوں کے درمیان احکامِ الٰہی کے اجرا کے لیے، اللہ کی خلافت ہے اور اللہ تعالیٰ کے قوانین، جیسا کہ شرائع کے مطالعہ سے ثابت ہے، بندوں کے لیے سراپا خیر اور مصلحت ہوتے ہیں اس لیے جس قوم میں عصبیت، جو قوت و استطاعت کی کفیل ہے، اور خصائلِ خیر، جو احکامِ الٰہی کی تنفیذ کے لیے مناسب ہیں، پائے جائیں وہ قوم کفالتِ خلق اور خلافتِ الٰہیہ کی اہلیت و استعداد

سے بھرپور بھی جائے گی"۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اس حقیقت کی طرف جا بجا ارشادات کیے ہیں لیکن یہ چیز اس قدر واضح ہے کہ زیادہ شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس امر میں کون شخص شک کر سکتا ہے کہ سیاست اور حکومت کا اصل مقصد زمین میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی کفالت ہے، اس وجہ سے اس نعمت سے وہ اسی قوم کو سرفراز فرمائے گا جو اس کے لیے موزوں اہلیت و استعداد رکھتی ہوگی۔

ہم بوجھ ڈھونے کے لیے ایک مزدور چاہتے ہیں تو اس میں محنت و جفاکشی ڈھونڈتے ہیں، اپنے مال و متاع کی نگرانی کے لیے محافظ چاہتے تو اس میں مستعدی و سرگرمی کے ساتھ امانت و دیانت تلاش کرتے ہیں، بچوں کے لیے اتالیق و نگران کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی ایسے شخص کا پتہ لگاتے ہیں جس میں علم اور اخلاص کے محاسن کے ساتھ شفقت و محبت ہو۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہ رب العالمین اپنی مخلوق کی کفالت کے لیے جب کسی قوم کو چننا چاہتا ہے تو اس قوم کو برگزیدہ فرماتا ہے جو جملہ محاسنِ خیر سے آراستہ ہو۔ وہ اپنے گلّہ کا چرواہا ایسے درندہ صفت انسانوں کو نہیں بناتا جو بھیڑوں کا گوشت کھالیں اور ان کی کھالوں کے کپڑے بنا کر پہن لیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ	اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد
مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ	لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے
الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ	نیک بندے ہی ہوں گے۔

(الانبیآء - ۲۱ : ۱۰۵)

اب غور کیجیے، وہ خصائلِ خیر، جو کفالتِ خلقِ الٰہی کے لیے ضروری ہیں اور جن کی طرف علامہ ابنِ خلدون نے اشارہ کیا ہے، کسی قوم میں کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟ سیاست کے لیے جس اخلاق اور جس کیریکٹر کی ضرورت ہے اس کی تفصیلات میں

پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہی ہے۔ مجرد یہ حقیقت کہ حکومت کا اصل مقصد خلق الٰہی کی کفالت ہے، اس بات کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے کہ حکومت کے لیے کسی قوم کے کیریکٹر میں کیا کیا باتیں ہونی چاہئیں۔ البتہ جب آپ ایک قدم آگے بڑھ کر، اس سوال پر غور کریں گے کہ کسی قوم میں یہ فضائل و محاسن کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی جواب ہوگا کہ نماز! کیونکہ، جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، جملہ حسنات و فضائل کا اولین سرچشمہ نماز ہے۔ اسی سے تمام بھلائیاں وجود میں آتی ہیں، اور پھر وہی تمام بھلائیوں کی حفاظت و نگہداشت کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کی تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو برگزیدہ کیا اور ان کو وہ عزت و شوکت بخشی، جو زمین پر بسنے والی قوموں میں سے کسی قوم کو نہ بخشی، جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے:

اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعٰلَمِينَ ۝

اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اٹھائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں بخشا۔

(المآئدۃ - ۵ : ۲۰)

تو ان سے میثاق لیا اور اس عظمت و شوکت کو اس میثاق کے قیام و استحکام کے ساتھ مشروط کیا کہ جب تک تم اس میثاق پر قائم رہو گے اللہ کا یہ عہد قائم رہے گا اور جب تم اس کو توڑ دو گے، خدا کی بخشی ہوئی تمام عزت و عظمت تم سے چھن جائے گی۔ یہ میثاق سورۂ مائدہ میں مذکور ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمائیے، اس میثاق کی پہلی دفعہ نماز ہے:

وَلَقَدْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مقرر کیے اور اللہ نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز کا اہتمام رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرتے رہو گے، اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے تو میں تم سے تمہارے گناہ دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد بھی تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔

(المآئدۃ - ۵ : ۱۲)

لیکن یہود اس میثاق پر قائم نہ رہ سکے۔ وہ نماز غائب کر کے شہوات میں پڑ گئے: 'اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ' (مریم - ۱۹ : ۵۹) (جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے) جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت و خواری اور دنیا کی دوسری قوموں کی محکومی اور بندگی کے لیے چھوڑ دیا:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قٰسِيَةً

پس ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے کے سبب سے ہم نے ان پر لعنت کر دی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

(المآئدۃ - ۵ : ۱۳)

بعینہٖ یہی معاملہ خانۂ کعبہ کے پاسبانوں کے ساتھ ہوا۔ اس کی تعمیر کا مقصد بھی جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور اس کے نام سے ثابت ہے، قیامِ نماز ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً	اور یاد کرو، جب کہ ہم نے بیت اللہ
لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا	کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ
مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى	بنایا اور حکم دیا کہ مسکنِ ابراہیم میں
وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ	ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور
وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ	اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ	کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝	رکوع، سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

(البقرۃ - ۲ : ۱۲۵)

اس مقدس گھر کے جوار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی جو ذریت آباد کی، اس کے متعلق یہ دعا فرمائی:

رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ	اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد
ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ	میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں
عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا	تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے اے
لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ	ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں
اَفْـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىْٓ	تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل
اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ	کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی
لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۔	عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔

(ابراھیم - ۱۴ : ۳۷)

رَبِّ اجْعَلْنِىْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ	اے میرے رب! مجھے نماز کا اہتمام کرنے
وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۖ رَبَّنَا	والا بنا، اور میری اولاد میں سے بھی،
وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ	اے ہمارے رب! اور میری دعا
(ابراھیم - ۱۴ : ۴۰)	قبول فرما۔

چنانچہ بنی اسماعیل کی پوری تاریخ سے ثابت ہے کہ یہی نماز ہمیشہ ان کے عزل و نصب کی کسوٹی رہی۔ اسلام کے ظہور کے وقت خانۂ کعبہ کی پاسبانی اور اس کے واسطہ سے تمام عرب کی دینی پیشوائی اور حکومت قریش کو حاصل تھی۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا فرمائی تھی کہ: رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں) اس دعا کو انہی کے ذریعے پورا ہونا تھا، لیکن انہوں نے خانۂ کعبہ کے اس بنیادی مقصد اور اپنے وجود و قیام کی اس اصلی غایت کو فراموش کرکے اس پاک گھر کو، جو اس دنیا میں توحید اور خدا پرستی کا اکیلا گھر تھا شرک و بت پرستی کا مرکز بنا دیا اور ان کی نماز، جو خانۂ کعبہ اور خانۂ کعبہ کے ساتھ خود ان کے قیام و وجود کی اصلی غایت تھی، شرک سے آلودہ ہو کر، چند بے ہودہ اور بے معنی مراسم مشرکانہ کا مجموعہ رہ گئی۔

اس حالت کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنا آخری پیغمبر —— صلی اللہ علیہ وسلم —— اٹھایا، جس نے دینِ حق کے تمام مٹے ہوئے آثار و مراسم کو زندہ کرنا چاہا اور ان کو اصلاحِ حال کی دعوت دی، لیکن انہوں نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرے، بلکہ اس کی مخالفت اور دشمنی پر آمادہ ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنی شفقت و محبت کا رشتہ اس جماعت سے جوڑ لیا، جو صحیح نماز کو قائم کرنے والی تھی۔ اس کے بعد قوت و شوکت کی فراوانی اور مذہبی پیشوائی کے غرور کے باوجود بدر کے میدان میں ان کو نہایت ذلت آمیز شکست ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی شکست کا

سبب یہ بیان فرمایا:

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝

(الانفال - ۸: ۳۴ - ۳۵)

اور اللہ ان کو کیوں نہ عذاب دے گا جب کہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں درآنحالیکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں۔ اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔

یعنی اگر ان میں کوئی خوبی اور فضیلت کی بات تھی تو یہ تھی کہ وہ خدا کے گھر کے محافظ و نگہبان تھے اور ان کے ذریعہ بیت اللہ کا مقصدِ تعمیر —— یعنی قیام نماز —— پورا ہوتا تھا، لیکن تولیت کی اصل شرط تقویٰ ہے اور اس سے وہ بالکل خالی ہیں۔ رہ گئی نماز، سو اس کا حال یہ ہے کہ اس کی ہیئت اور حقیقت، دونوں انھوں نے مسخ کر کے رکھ دی ہے، اب وہ محض تالی پیٹنے اور سیٹی بجانے سے عبارت ہے۔ پھر کیا چیز ہے جس کے لیے اللہ ان سے اپنا رشتہ قائم رکھے، اور کیوں ایسا نہ ہو کہ ان کی جڑ کاٹ دی جائے کہ ان کی جگہ پر وہ جماعت آئے جو خانہ کعبہ کے مقصد سے واقف ہو، جو بیت اللہ کی تولیت اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد نماز قائم کرے گی، زکوٰۃ دے گی، نیکی کا حکم کرے گی، برائی سے روکے گی:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝

(الحج - ۲۲: ۴۰ - ۴۱)

اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

یہ بات اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہی بتا دی تھی۔ ان کو جب امامت و سیادت کی عزت حاصل ہوئی تو انھوں نے چاہا کہ یہ عزت ان کی اولاد کو بھی حاصل رہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ چیز تمہاری اولاد کے لیے عام نہ ہوگی، صرف اللہ کے لیے مخصوص ہوگی۔ جو دین کی تعلیمات اور شریعت کے احکام پر قائم رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو بے شک عزت و شوکت اور حکومت و سیادت بخشے گا، اور جو عہد تم سے باندھا جا رہا ہے اس کی برکتوں سے وہ بھی متمتع ہوں گے۔ لیکن جو خدا کے عہد کو توڑ دیں گے اور پیغمبروں کی سکھائی ہوئی نیکیوں اور سچائیوں کو فراموش کر کے نفس و شیطان کی پیروی کرنے لگ جائیں گے، ان کے لیے اس عہد میں سے کوئی حصہ نہ ہوگا:

قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝

(البقرۃ - ۲: ۱۲۴)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ اس نے پوچھا: اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا: میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے۔

پس جب اہلِ مکہ نے توحید اور نماز کو ضائع کر کے وراثتِ ابراہیمی کا استحقاق کھو دیا تو دوسری جماعت اہلیت و صلاحیت کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہو کر نمودار ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی کلید، جو درحقیقت تمام اقوام و امم کی سرداری کی کلید تھی، ان سے چھین کر اس اہل اور صالح جماعت کو بخش دی۔ یہ اس سنتِ الٰہیہ کا ظہور و اعلان تھا، جس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ	اور اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری
قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا	جگہ دوسروں کو لائے گا، پھر وہ تمہاری
يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝	طرح نہ ہوں گے۔

(محمد - ۴۷ : ۳۸)

یہ وہ اہل و صالح جماعت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی پاسبانی کی عزت سے ان کو نوازا اور ساتھ ہی ان سے عہد لیا کہ اس گھر کے بنیادی مقصد، نماز کو فراموش نہ کریں گے۔ ورنہ جس طرح یہ امانت دوسروں سے چھین کر ان کو بخشی گئی ہے، اسی طرح ان سے چھین کر دوسروں کو بخش دی جائے گی۔ چنانچہ فرمایا :

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝	ہم نے تم کو بخشا کوثر۔ تو اپنے خداوند
فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝	ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے
(الکوثر - ۱۰۸ : ۱-۲)	قربانی کرو۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی (علیہ الرحمۃ) نے سورۂ کوثر کی تفسیر میں پوری تفصیل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ کوثر سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ یہاں اس کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ خانہ کعبہ کی تفویض کے اعلان کے ساتھ مسلمانوں سے سب سے پہلا جو عہد لیا گیا وہ نماز اور قربانی کا عہد

تھا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ یہی دو چیزیں اس نعمت کے بقا کی ضامن ہیں۔ جب تک ان کا اہتمام قائم رہے گا، یہ نعمت اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی تمام نعمتیں حاصل رہیں گی۔ جب یہ فراموش ہو جائیں گی، اس گھر کی تولیت اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام نعمتیں چھن جائیں گی۔

تفسیر سورۂ کوثر میں 'فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ' کی تفسیر کرتے ہوئے استاذ امامؒ نے جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارات کیے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر کے عطیہ کی بشارت دینے کے بعد دو باتوں کا حکم دیا: نماز اور قربانی۔ اور امر کے صیغہ پر تعقیب کی 'ف' داخل کی ہے جو سابق و لاحق یعنی عطیہ اور حکم کے درمیان، تعلق اور نسبت کی دلیل ہے۔

"اس حکم میں اس بخشش کا اصل مقصود پنہاں ہے، کیونکہ یہ ایک بہت بڑے مقصد کی خاطر تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے :

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى	یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں
الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ	اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ	دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔

(الحج - ۲۲ : ۴۱)

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرمایا :

رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ	اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد
ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ	میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں
زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ	تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے،
رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ	اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں

أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ إِلَيْهِمْ　　تو تُو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے۔

(ابراھیم - ۱۴ : ۳۷)

"اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، اپنے قدیم وطن سے ہجرت کر کے، ایک بے آب و گیاہ سرزمین میں بسنا محض اس لیے تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کا ایک مرکز تعمیر ہو جو لوگوں کی عقیدت و انابت، سعی و طواف اور نذر و نیاز کا قبلہ ہو اور جس طرح غلام اپنے آقا کی ڈیوڑھی پر گوش برآواز، سرگرم عمل رہتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ کہتے ہوئے دوڑیں۔"

اسی سلسلہ میں کچھ آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں :

"اس سے معلوم ہوا کہ اس گھر —— بیت اللہ —— کی تعمیر نہایت عظیم الشان مقاصد کے لیے ہوئی ہے اور خدا نے انہی مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کو —— مسلمانوں کو —— اس پر قبضہ دیا۔ ان مقاصد کا لب لباب دو چیزیں ہیں : نماز اور قربانی۔ پس عطیہ کے ذکر کے بعد ان دونوں کا ذکر کر دیا کہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ عطیہ یونہی نہیں مل رہا ہے، بلکہ اس کے کچھ حقوق و فرائض ہیں، جن کا اہتمام اصلی مقصود ہے۔ یہ گویا بقائے حقوق کے عام اور معروف قانون کے مطابق ایک مستم حق کا اظہار کیا گیا، کیونکہ کوئی عطیہ بغیر کسی کی ذمہ داری کے نہیں ملتا۔ جب ہم کچھ لیتے ہیں تو لامحالہ کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بھی آمادہ رہنا چاہیے۔"

اس عطیہ اور فرض کے عام ہونے کے پہلو کی طرف مولانا اشارہ کرتے ہیں :

"پس نماز اور قربانی کا حکم تمام امت کے لیے عام ہوا کیونکہ یہ نعمت بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے عام تھی۔ پیغمبر امت کا وکیل ہوتا ہے اس لیے جو کچھ اس کو ملتا ہے، اس میں امت بھی شریک ہوتی ہے . . . پس یہاں نماز

اور قربانی کا حکم عام ہے۔ یہ بات سیاقِ کلام سے ظاہر ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ جب کوئی عبادت کسی عطیہ کے ساتھ مخصوص کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی پابندی ہی اس نعمت کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ آیت ذیل اس قانونِ الٰہی کی طرف اشارہ کر رہی ہے :

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ　　اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرے۔

(الرعد - ۱۳ : ۱۱)

"یہاں جیسا کہ سباق سے ظاہر ہے حج اور اس کے دوسرے آداب و مراسم کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ ہم نے تم کو کوثر بخشا، پس اس کے حقوق ادا کرو کہ یہ نعمت تمہارے لیے باقی رہے۔"

اس عہد کی مولانا مزید تشریح فرماتے ہیں:

"یہ اس عہد کا بیان ہے جس کی ذمہ داری خدا کے عطیہ کے بعد از خود ہم پر عائد ہو جاتی ہے، کیونکہ نماز اور قربانی کے حکم کو خدا نے اپنے عطیہ کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس لیے جب ہم نے اس کا عطیہ قبول کر لیا تو اس حکم کو بھی اپنے اوپر واجب کر لیا۔ پس جب تک اس عہد پر قائم رہیں گے، یہ عطیہ بھی ہمارے لیے باقی رہے گا۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے، جیسا آدمؑ و حوا کے ساتھ ہوا تھا۔ خدا نے ان کو جنت میں سکونت اور ہر نعمت سے آزادانہ متمتع ہونے کی اجازت دی، لیکن ایک مخصوص درخت کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔ جب انہوں نے اس کے بخشے ہوئے عطیہ کو قبول کر لیا تو ان پر یہ عہد بھی خود بخود واجب ہو گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں اس کو "عہد" ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا :

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى اٰدَمَ　　اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک

مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ	عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور
نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝	ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی۔

(طٰہٰ - ۲۰ : ۱۱۵)

"چنانچہ یہ عطیہ اسی وقت تک باقی رہا جب تک وہ دونوں اپنے عہد پر قائم رہے"

تولیتِ کعبہ کی تفویض کے وقت جس طرح مسلمانوں کو نماز کا حکم ہوا اسی طرح یہود کو بھی ارضِ مقدس کی تفویض کے وقت نماز کا حکم ہوا :

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ	اور یاد کرو، جب کہ ہم نے کہا : داخل ہو
الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا	جاؤ اس بستی میں، پس کھاؤ اس میں سے
حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا	جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ اور داخل ہو
وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا	دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور دعا
وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ	کرو کہ اے رب! ہمارے گناہ بخش دے
خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ	ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور اچھی طرح حکم
(البقرۃ - ۲ : ۵۸)	بجا لانے والوں پر ہم مزید فضل کریں گے۔

لیکن یہود، جیسا کہ ہم اوپر تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اس عہد کو بھول گئے، بلکہ انہوں نے شرارت سے دعا کے الفاظ میں ایسی تبدیلی کردی، جس سے اس کی حقیقت ہی بالکل مسخ ہوگئی :

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا	تو جنہوں نے ظلم کیا انہوں نے بدل
قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ	دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی
لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى	دوسری بات سے۔ پس ہم نے ان
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ	لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا ان کی نافرمانی
السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝	کے سبب سے آسمان سے

(البقرۃ - ۲ : ۵۹)	عذاب اتارا۔

اس عہد شکنی پر یہود کو بار بار تنبیہیں ہوئیں، جن کی تفصیلات تورات اور قرآن مجید میں مذکور ہیں، لیکن یہود کی قساوت اس درجہ سخت و شدید تھی کہ ان تنبیہات کے باوجود ان کو اصلاحِ حال کی توفیق نہ ہوئی اور اگر ہوئی بھی تو اس کا اثر بالکل عارضی ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد غفلت و نسیان کی وہی خود فراموشی اور نا عاقبت اندیشی ان پر پھر طاری ہوگئی، جو پہلے طاری تھی۔ یہاں تک کہ ان کی پشتِ غفلت کے لیے خدا کا آخری تازیانہ نمودار ہوا جس نے ان کی ریڑھ کی ہڈی تک توڑ دی۔ قرآن مجید اور یہود کے صحیفوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں اور اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہیں۔ یہاں سورۃ بنی اسرائیل سے چند اشارات نقل کیے جاتے ہیں :

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ
فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى	سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ
الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ	زمین میں فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ	گے۔ پس جب ان میں سے پہلی بار کی
وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا	میعاد آجاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور
عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ	بندے مسلط کر دیتے ہیں تو وہ گھروں میں
بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا	گھس پڑے اور شدنی وعدہ پورا ہو کے
خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ	رہا..... پھر جب پچھلی بار کی میعاد
وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ .... فَاِذَا	آجاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور بندے
جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا	مسلط کر دیتے ہیں کہ وہ تمہارے چہرے
وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا	بگاڑ دیں اور تاکہ وہ مسجد میں گھس
الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ	پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا	اور تاکہ جس چیز پر ان کا زور چلے اسے

عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ تہس نہس کر ڈالیں۔

(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۴ - ۷)

افسوس ہے کہ ٹھیک ٹھیک یہی حالت، جیسا کہ بعض احادیث میں پیشین گوئی کی گئی تھی، مسلمانوں کو پیش آئی۔ خانۂ کعبہ کی تفویض کے وقت، جو درحقیقت تمام دنیا کی حکومت و سیادت کی تفویض کا دیباچہ تھی، مسلمانوں سے نماز کا جو عہد لیا گیا تھا، کچھ دنوں بعد آہستہ آہستہ انہوں نے اس کو فراموش کر دیا اور بتدریج نوبت یہاں تک پہنچی کہ یا تو اگلی امتوں کی طرح، مسلمانوں کے اندر سے نماز یک قلم اٹھ گئی یا باقی رہی تو اس کو نماز کی اصل ہیئت اور حقیقت سے لگاؤ نہیں رہ گیا ہے۔ اور جن لوگوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، وہ اعتراف کریں گے کہ مسلمانوں کے اندر جب تک نماز کی حقیقت محفوظ رہی، ان کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے، لیکن جوں جوں ان کے دل اور دلوں کے ساتھ مسجدیں ویران ہوتی گئیں، ان کی پھیلی ہوئی عظمت سمٹنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ جس طرح رومیوں اور ایرانیوں نے یہود کو تاراج کر دیا، اسی طرح نصاریٰ نے مسلمانوں کی تمام سطوت پارہ پارہ کر ڈالی۔

ایک شبہ کا جواب :

ممکن ہے کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب سیادت و حکومت کا حصول نماز کے قیام پر منحصر ہے تو چاہیے کہ وہ اس نعمت سے محروم رہیں جن کے اندر نماز مفقود ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حکومت کی دو قسمیں ہیں: ایک خلافتِ الٰہیہ، دوسری حکومت و بادشاہی۔

خلافتِ الٰہیہ میں خدا کا قانون فرمانروا ہوتا ہے۔ انسانوں کی مرضی و خواہش کو اس میں

کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کا قانون خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے اور تمام زمین کے لیے یکساں اور عام ہوتا ہے۔ اس میں رنگ اور خون کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ خدا کے سورج کی طرح اس کی فیض رسانی تمام مخلوق کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ اس میں آزادی اور مساوات کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر خلیفۂ وقت بھی کوئی ایسی بات کہے جو خدا کے حکم کے خلاف نظر آئے تو ایک بڑھیا کو بھی حق پہنچتا ہے کہ علانیہ اس کو ٹوک دے۔ کیونکہ خلافتِ الٰہیہ میں، زمین والوں کو، صرف تنقید کا حق ہے، ان کو کوئی نیا قانون گھڑنے کا اختیار نہیں ہے۔ قانون سازی کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہے۔ اگر کوئی ایسی بات پیش آ جائے، جس کے متعلق آسمانی قانون کے اندر کوئی صاف رہنمائی موجود نہ ہو تو اس ایک معصوم وجود ——— صلی اللہ علیہ وسلم ——— کے اقوال و اعمال کو دیکھیں گے جو آسمانی قانون کا اوّلین حامل رہا ہے اگر اس کے اقوال و اعمال میں بھی کوئی صاف اور صریح رہنمائی موجود نہ ہو تو ادنیٰ درجہ میں اس کے اشارات پر چلیں گے یا اجماع کی پیروی کریں گے، مگر یہ نہیں کریں گے کہ کوئی بات اپنے جی سے گھڑ لیں۔ جس دائرہ کے اندر خود اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے قانون سازی کی آزادی حاصل ہے اس دائرہ کے اندر بھی کوئی ایسا قانون بنانے کا حق کسی کو نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے کسی امر و نہی کے خلاف ہو۔

ایسی سیادت و حکومت کے حصول اور بقا کے لیے قیامِ نماز اوّلین شرط ہے۔ یہ نماز ہی سے وجود میں آتی ہے اور نماز ہی سے باقی رہتی ہے۔ نماز سے اس کو اس درجہ قریبی علاقہ ہے کہ جو شخص نمازوں میں ہمارا امام ہو سکتا ہے وہ بے تکلف اس آسمانی حکومت کا صدر بھی ہو سکتا ہے۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے استحقاقِ خلافت کی ایک بڑی وجہ یہی بتائی گئی تھی کہ جس کو رسول اللہ ——— صلی اللہ علیہ وسلم ——— نے ہماری دینی پیشوائی کے لیے چنا، کیا ہم اس کو اپنی دنیاوی سیاست کے لیے نہیں انتخاب کر سکتے۔ دنیا میں امتِ مرحومہ کا اصل وظیفہ قیامِ نماز ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذرّیت کے

لیے جو پہلی دعا کی اس میں یہ فرمایا تھا : "رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ" (ابراھیم - ۱۴ : ۳۷) (اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں) ۔ اور بعینہٖ یہی حقیقت اس آیت میں دہرائی گئی ہے ، جو اوپر گزر چکی ہے :

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ ۔

یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے ۔

(الحج - ۲۲ : ۴۱)

پس خلافت کا اصلی اور بنیادی مقصد قیامِ نماز ہوا ، اس لیے جو شخص تمام مسلمانوں میں اس قابل گنا گیا کہ ان کی نمازوں میں ان کی امامت کرے وہ بدرجۂ اُولیٰ اس قابل بھی سمجھا گیا کہ ان کے دوسرے امور میں ان کی سربراہی بھی کرے ۔

نماز اپنے باطن میں جس طرح دین کی تمام بنیادی تعلیمات کا سرچشمہ ہے ، اسی طرح اپنے ظاہر میں ، دین کے پورے نظام اور خلافتِ الٰہیہ کے تمام اساسی مقاصد و اغراض کا خاکہ ہے ۔ یعنی اگر ایک شخص یہ جاننا چاہے کہ خلافتِ الٰہیہ کیا ہے ؟ اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل کیونکر ہے ؟ اس کے قانون کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ دنیا میں اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کیا ہیں ؟ اس میں امیر و مامور کے حدود و اختیارات کیا کیا ہیں ؟ تو ان امور کو جاننے کے لیے وہ اس بات کا محتاج نہ ہوگا کہ وہ اسلام کے پورے دستور کا مطالعہ کرے ، بلکہ وہ کسی گاؤں کی چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں جا کر مسلمانوں کی نماز کی صفیں دیکھ لے ۔ دیدۂ بینا صرف ایک ہی چیز کے اندر وہ سب کچھ پالے گی جو ہزاروں صفحات میں بیان نہیں ہو سکتا ۔

ہم نے اپنے مضمون کو صرف باطنِ نماز سے متعلق رکھا ہے ورنہ ہم دکھاتے کہ نماز کی ظاہری شکل و ہیئت ہمارے پورے نظامِ حق اور ہماری ہیئتِ اجتماعیہ کی کتنی مکمل اور خوب صورت تصویر ہے ۔

یہی نکتہ ہے کہ مسلمانوں کے فرضِ اجتماعی ، یعنی شہادتِ حق کے لیے قیامِ نماز کو ضروری قرار دیا گیا :

مسلمانوں کا فرضِ اجتماعی قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے ۔

(البقرۃ - ۲ : ۱۴۳)

اور سورۂ حج کی آخری آیت میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اقامتِ نماز کو ضروری قرار دیا گیا ہے ، چنانچہ فرمایا ہے :

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔

تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو ۔ اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو ۔

(الحج - ۲۲ : ۷۸)

ان دونوں آیتوں کو ملا کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ و دعوت کی جو ذمہ داری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوتی تھی ، وہ ذمہ داری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافتِ الٰہیہ کی شکل میں امت پر منتقل ہو گئی ، اور امت کے لیے اس ذمہ داری کے ادا کرنے کی راہ اقامتِ نماز اور ایتائے زکوٰۃ بتائی گئی ۔ یعنی اگر امت نماز اور زکوٰۃ کو ان کے تمام شرائط و آداب کے ساتھ قائم رکھے تو گویا اس نے اپنے فرضِ منصبی یعنی شہادت علی الناس کو ادا کیا ، جس کے بعد وہ دنیا میں باقی رہنے اور پیغمبر ـــــ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ کی وراثت سے سرفراز ہونے کی مستحق ہے ۔ لیکن اگر وہ نماز کو ضائع کر دے تو اس کے معنی

یہ ہوئے کہ اس نے خلافتِ الٰہیہ کے اس بنیادی مقصود کو ضائع کر دیا، جس کے بعد اس کے باقی رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے مبارک عہد میں دین و دنیا کے تمام امورِ مہمہ کا مرکز مسجد ہی تھی اور خلیفۂ وقت کے اولین فرائض میں سے یہ بات تھی کہ وہ پنج وقتہ نمازوں میں مسلمانوں کی امامت کرے۔ کیونکہ جس خلافتِ الٰہیہ کا وہ امیر ہوتا تھا اس کا پہلا مقصد ہی یہی تھا کہ دنیا میں نماز قائم ہو اور نماز کی شکل میں خدا کی اس آخری دعوت کی شہادت دی جائے جس میں دنیا کی نجات کا راز مضمر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نماز کی امامت کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخصیت خلیفۂ وقت کی ذات ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جب تک مسلمانوں میں نماز کی یا اہمیت و عظمت باقی رہی، اس وقت تک امامت کی خدمت خلفائے اسلام ہی انجام دیتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ، جب دین کی حقیقت اور اسی کے ساتھ ساتھ نماز کی عظمت فراموش ہو گئی اور دنیا پرست امراء مسلمانوں کے فرمانروا ہوئے تو انہوں نے مسجدوں اور جماعتوں کی حاضری ترک کر دی؛ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ دور انگیز زمانہ آگیا کہ آج دنیا کے ہر کام کے لیے اہلیت و صلاحیت کا سوال ہوتا ہے، لیکن نمازوں میں امامت کے لیے کسی اہلیت و صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے۔

حکومت کی دوسری قسم حکومت و پادشاہی کا سرچشمہ نماز نہیں، بلکہ عصبیت ہے۔ عصبیتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں؛ خون کی عصبیت، رنگ کی عصبیت، سرزمین اور وطن کی عصبیت وغیرہ وغیرہ۔ نسل اور خون، رنگ اور سرزمین اور تمدن میں سے کوئی چیز انسانوں کی کسی جماعت اور گروہ میں اجتماع اور اتحاد کی وہ حالت پیدا کر دیتی ہے، جس سے حکومت کی ایک شکل قائم ہو جاتی ہے۔ یہ حکومت رنگ اور نسل کے امتیازات پر قائم ہوتی اس لیے علمِ الٰہی سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ اس کے تمام فوائد انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی بہتر سے بہتر شکل بھی انسانیت کے لیے عذاب

اور لعنت ہے۔ موجودہ زمانہ کی تمام حکومتیں اور پچھلے زمانوں کی تمام غیر الٰہی حکومتیں اسی عصبیت کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں اور ان کی حقیقت ڈاکوؤں کے منظم جتھوں سے زیادہ نہیں ہے۔

اس طرح کی حکومت یا حکومتیں دنیا کے امن کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا وجود نہیں، بلکہ عدم مطلوب ہے۔ لیکن چونکہ اس دنیا میں خدا نے حق کے ساتھ باطل کو بھی جینے کی مہلت دی ہے، اس وجہ سے وہ اس طرح کی حکومتوں کو بھی سر اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور وہ جس سزا کی مستحق ہیں اس کا فیصلہ وہ خود اپنے قلم سے اپنے لیے لکھ لیں۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق صرف باطن نماز سے ہے۔ ظاہر نماز پر ہم نے کچھ نہیں کہا ہے، بلکہ باطن نماز کے بھی صرف ان گوشوں پر نگاہ ڈالی گئی ہے جو بہت نمایاں تھے۔

27